ہفت روزہ

ترجمان اسلام

ج

نگران اعلیٰ

مفتی محمود

گذارش

ترجمان اسلام کے آیندہ شمارے
میں بلوچستان کی موجودہ
صورت حال پر
مولانا محمد صدیق
شاہ صاحب
کا
مبسوط انٹرویو شائع ہو رہا ہے
یہ انٹرویو
عمیر الہاشمی صاحب نے
قلمبند کیا ہے۔

(ادارہ)

18
14

حالات و واقعات

زاہد الراشدی

انور السادات کی فراست

۲۵، مارچ ۷۵ء کو اخبارات میں ڈاکٹر ہنری کسنجر وزیر خارجہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا یہ بیان جلی سرخیوں سے شائع ہوا کہ مشرق وسطیٰ میں ان کا امن مشن اسرائیل کی ہٹ دھرمی کے باعث ناکام ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ صدر انور سادات کا یہ نعرہ حق بھی منظرِ عام پر آیا کہ اسرائیل نے ہٹ دھرمی ترک نہ کی تو جہاد شروع کیا جائے گا اور عرب وزراء خارجہ کا ہنگامی اجلاس طلب کیے جانے کی خبر بھی اخبارات کی زینت بنی۔ یہ خبریں اس امر کا احساس دلانے کو کافی تھیں کہ مشرق میں "کچھ" ہونے والا ہے اور عرب عوام کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی "سامراجی خواہش" کسی چونکا دینے والے حادثہ کو جنم دینے والی ہے۔ چنانچہ اس روز ریڈیو سے اعلان نشر ہوا کہ سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل بن عبد العزیز کو ان کے بھتیجے فیصل بن مساعد بن عبد العزیز نے شاہی محل میں گولی مار کر شہید کر دیا ہے۔

پوری دنیائے اسلام پر یہ خبر بجلی بن کر گری اور جس شخص نے بھی یہ اندوہناک خبر سنی ساکت و مبہوت ہو کر رہ گیا۔ شاہ فیصل شہید نے انتہائی تدبر و فراست اور جرأت و استقلال کے ساتھ یہود اور ان کے سامراجی پشت پناہوں کا مقابلہ کیا تھا۔ فراخدلی کے ساتھ مصر و شام اور اردن کو مالی امداد دے کر "اغیار" کے رحم و کرم کا شکار ہونے سے بچایا تھا اور تیل کے ہتھیار کو بڑی کامیابی کے ساتھ دنیائے اسلام اور عرب عوام کے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا ان عظیم خدمات کے پیش نظر ہر مسلمان کے دل میں شاہ فیصل کی محبت و عقیدت گھر کر گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ فیصل شہید کے جسم میں پیوست ہونے والی گولیاں ہر درد مند مسلمان نے اپنے دل میں لگتی ہوئی محسوس کیں اور پورا عالم اسلام سوگوار ہو گیا۔

فیصل شہید کے ساتھ عقیدت و محبت کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کی حکومت اور فیصل کی جرأتمندانہ پالیسیوں کے مستقبل کا سوال بھی سامنے تھا اور یہ خدشہ ہر زبان پر تھا کہ کہیں سعودی عرب کو کسی "نام نہاد انقلاب" کے ذریعہ سازشوں کے غار میں نہ دھکیل دیا جائے اور سعودی عرب جس نے ایک مدت تک مغربی سامراج کے زیر اثر رہنے کے بعد امریکی سامراج کی سازشوں کو سمجھنے اور ان سے نبرد آزما ہونے کی جرأتمندانہ روش اختیار کر لی تھی۔ کہیں اس کے گرد سازشی حصار کو مزید تنگ نہ کر دیا جائے۔ لیکن خدا بھلا کرے جمال عبد الناصرؒ کے جانشین عربوں کے محبوب قائد اور مصر کے غیور و جسور صدر جناب انور السادات کا کہ انہوں نے آگے بڑھ کر ان سازشوں کا دروازہ بند کر دیا۔ شاہ فیصل کے جانشین شاہ خالد نے حال ہی میں ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ شاہ فیصل کی شہادت کے بعد جناب انور السادات نے ان سے فون پر رابطہ قائم کیا تو سادات کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ چیخ رہے ہیں۔ سادات کو خدشہ تھا کہ شاہ فیصل کے قتل کی پشت پر سعودی عرب میں انقلاب کی کوئی سازش کارفرما ہے۔ اس لیے انہوں نے مصری افواج کی کمان فوری طور پر ان کے (شاہ خالد کے سپرد کر دی تاکہ وہ اس خطرہ سے نبرد آزما ہو سکیں۔

شاہ خالد کے اس بیان کے مطابق صدر انور السادات کے خیال میں یہ قتل انقلاب کی کسی سازش کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے افواج مصر کی کمان شاہ خالد کے سپرد کر دی حقیقت یہ ہے کہ صدر سادات کا یہ جرأتمندانہ اقدام ان کی ایمانی فراست اور سعودی عرب کے عوام کے ساتھ ان کی گہری محبت کا آئینہ دار ہے اور کچھ بعید نہیں کہ صدر سادات کی اس بروقت مداخلت کی وجہ سے ہی معاملہ صرف شاہ فیصل کی شہادت پر رک گیا ہو۔

شاہ فیصل کی المناک شہادت کے بعد شاہی خاندان نے متفقہ طور پر ان کے چھوٹے بھائی اور ولی عہد شاہ خالد بن عبد العزیز کو سعودی عرب کا فرمانروا منتخب کر لیا۔ اور ریاض میں لاکھوں مسلمانوں نے عالم اسلام کے عظیم راہنما شاہ فیصل کی نماز جنازہ ادا کر کے انہیں سوگوار دلوں اور پرنم آنکھوں کے ساتھ ایک سادہ اور بے نام قبر میں سپرد خاک کیا۔

ہفت روزہ
ترجمان اسلام
لاہور

جلد نمبر ۱۸ شمارہ نمبر ۱۴
جمعۃ المبارک ۱۱/اپریل، ۲۸ ربیع الاوّل

سرپرست
مولانا عبید اللہ انور

رئیس الادارہ
اکرام القادری

مجلس ادارت
مولانا سعید احمد رائے پوری
سید مطلوب علی زیدی
عمیر الہاشمی

★ ★

بدل اشتراک
سالانہ ——— ۳۸ روپے
ششماہی ——— ۱۹ روپے
سہ ماہی ——— ۹/۵۰ روپے
فی پرچہ
۷۵ پیسے

اداریہ

اکرام القادری

دفعہ ۱۴۴ کہاں ہے؟

جیساکہ اسلامیانِ پاکستان کو معلوم ہے کہ گذشتہ ماہ کے آخری عشرے میں جمعیۃ علمأ اسلام پاکستان کے زیر اہتمام لاہور میں ایک فقید المثال اور عدیم النظیر نظام شریعت کانفرنس منعقد ہونا تھی، کانفرنس کی تیاریاں ملک کے گوشے گوشے میں وسیع پیمانے پر کی جارہی تھیں۔

اس عظیم الشان کانفرنس میں ہزاروں علماء اور لاکھوں عوام نے شریک ہونا تھا۔ زعماء جمعیۃ علماء اسلام نے حکمرانوں اور مسلمانوں کو پاکستان کا مقصد تخلیق یاد دلانا تھا۔ جمعیۃ کے عظیم اور مقتدر رہنماؤں نے بتانا تھا کہ پاکستان کے لیے ناقابل فراموش قربانیاں کس نام پر اور کس مقدس مشن کی تکمیل کے لیے دی گئی تھیں؟ کیا وہ مشن مکمل ہو گیا ہے؟ کیا اس عظیم مقصد کے لیے کوشش کی جارہی ہے؟ کیا پاکستان میں خلافت راشدہ کے قیام کا سنہری خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا ہے؟ مسلمانانِ پاکستان اپنی منزل کے قریب آتے ہیں یا دُور سے دور تر ہوتے جارہے ہیں؟

خطرے کی ہر شاہ راہ پر جھنجوڑنے اور پیش آمدہ خدشات و خطرات سے آگاہ کرنے والے ان مردان حق آگاہ اور مجاہدین تحریکِ آزادیٔ برصغیر نے ان تمام سوالات کے معقول و معتدل جوابات دینے تھے۔ ان شمع حریت کے جانثاروں اور تحریک ولی اللّٰہی کے پاسداروں نے دیگر تمام ازموں کے مقابلے میں اسلام کے نظام عدل و مساوات سے ان عوام کو آگاہ کرنا تھا جو روٹی کپڑا اور مکان کے پرفریب نعروں کا شکار ہو گئے۔

مگر افسوس کہ اسلام ہمارا دین اور جمہوریت ہماری سیاست ہے کے بلند بانگ دعاوی کرنے والے نعرہ باز عوامی حکمرانوں کو یہ گوارہ نہ ہوا۔

ان ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے اس دور رس عظیم الشان کانفرنس کو اپنی راہ کا سنگِ گراں اور اپنے اقتدار کے لیے ضرب کاری سمجھتے ہوئے کانفرنس کے انعقاد کی اجازت دینے سے عین وقت پر انکار کر دیا اور دفعہ ۱۴۴ کی بے تمکین بیساکھیوں کا سہارا لیا جس سے نہ صرف جمعیۃ علماء اسلام سے وابستہ کروڑوں عوام کے دل مجروح ہوئے، بلکہ عامۃ الناس نے بھی عوامی حکومت کے اس غیر آئینی آمرانہ اور جمہوریت کش اقدامات کو نفرت و ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ حتیٰ کہ نوائے وقت کو بھی اس مکروہ فعل پر ادارتی شذرہ لکھنا پڑا۔

اس کے بعد اسی نوعیت کا سلوک پاکستان جمہوری پارٹی کے ساتھ روا رکھا گیا۔ لاہور کی انتظامیہ نے جمہوری پارٹی کو کنونشن کی اجازت دے کر منسوخ کر دی جس سے پارٹی کے زعماء اور کارکنوں کو شدید ترین مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔

اس کے برعکس نظام شریعت کانفرنس کے التوا کے فوراً بعد پاکستان پیپلز پارٹی یعنی عوامی حکومت نے رابطۂ عوام کی مہم کو سر کرنے کے سلسلے میں وزیر اعظم بھٹو صاحب کے دورۂ لاہور ڈویژن کے پروگرام کا اعلان کر دیا ——— محترم بھٹو صاحب نے مکمل جاہ و جلال اور پوری آن بان سے لاہور ڈویژن کا

دورہ شروع فرمایا۔ سیالکوٹ گئے، شیخوپورہ پہونچے، گوجرانوالہ قدم رنجہ فرمایا وغیرہ وغیرہ ہر جگہ جلسہ ہائے عام سے خطاب فرمایا۔ ان "عظیم الشان" جلسوں میں "عوام" کو کس طرح لایا گیا؟ قومی خزانے سے کس طرح دریا دلی سے روپیہ لٹا کر حاتم طائی کی یاد تازہ کی گئی؟ اور محترم وزیر اعظم نے کس کس کو غداری و ملک دشمنی کے تمغے دیئے یہ ایک الگ داستان ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ دفعہ ۱۴۴ جو قائد حزب اختلاف مولانا مفتی محمود نواب زادہ نصر اللہ خان اور دیگر اپوزیشن لیڈروں کو عوام سے رابطہ قائم کرنے کے سلسلے میں ہر ہر قدم پر مزاہمت کرتی ہے اور ہمالہ بن کر سامنے آتی ہے وہ محترم جناب بھٹو صاحب کے لیے کیوں فرش مخمل اور قاقم و سنجاب ثابت ہوتی ہے۔؟

نہ صرف بھٹو صاحب بلکہ ان کی پارٹی کا ہر وزیر و مشیر اور کبیر و صغیر جب چاہتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اپنے لاؤ لشکر اور مستقل سامعین سمیت عام جلسوں سے خطاب کرتا ہے۔ دفعہ ۱۴۴ کے ماتھے پر شکن تک نمودار نہیں ہوتے۔ دفعہ ۱۴۴/ نافذ کرنے والے ہٹو بچو کی صدا بلند کرتے اور استقبالیوں میں شامل ہوتے ہیں۔ شائد ایسے ہی موقع پر کسی نے کہا تھا کہ ہاتھی کے دانت دکھانے اور کھانے کے اور۔

نظام شریعت کانفرنس ۲۱، ۲۲، ۲۳ مارچ کو ہونا تھی۔ کانفرنس سے چند دن قبل ۲ ماہ کے لیے دفعہ ۱۴۴ نافذ کی گئی۔ کانفرنس کے التوا کے بعد ۶/اپریل کو مینار پاکستان کے سبزہ زار پلاٹوں میں محترم بھٹو صاحب نے خطاب فرمایا۔ کیا دفعہ ۱۴۴/ کی مدت ختم ہو گئی؟ کیا دو ماہ پورے ہو گئے؟ کیا جمعیۃ علماء اسلام کے عظیم قائد مولانا مفتی محمود نے درست فرمایا تھا کہ "دفعہ ۱۴۴ نظام شریعت کانفرنس کو روکنے کے لیے لگائی گئی ہے"۔ سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے ہر شخص کے لب پر یہ سوالات ہیں۔

بلوچستان اور سرحد میں جمعیۃ اور نیپ کے ممبران اسمبلی کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دینے کا معمہ؟ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ شائد "عوامی" حساب سے ایسا ہونا ممکن ہو۔

کہاں ہے وہ دفعہ ۱۴۴/ جو قائد حزب اختلاف کی راہ کا روڑہ اور پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی ہے؟ یہ "قائد عوام" کا راستہ کیوں نہیں روکتی؟ یہ فخر ایشیا کے پاؤں کا سنگریزہ کیوں نہیں بنتی؟ اس نے "محافظ ختم نبوۃ" کی حفاظت کو اپنا لازمہ حیات کیوں بنا رکھا ہے؟ محض اس لیے کہ قائد عوام نہ صرف قائد عوام، فخر ایشیا اور محافظ ختم نبوت ہیں، بلکہ وزیر اعظم بھی ہیں اور وزیر اعظم کا احترام نہ کرنا دفعہ ۱۴۴ کے فرض منصبی کے خلاف ہے۔

آخر میں ہم ارباب اقتدار سے عرض کریں گے کہ وہ اقتدار کی مستی میں اس قدر آگے نہ نکل جائیں کہ پیچھے لوٹنا مشکل ہو۔ اقتدار دھوپ چھاؤں کی مانند ہے۔ اس عالم ناپائیدار میں کسی کی نہیں بنتی۔ اصل مسئلہ ملک کی بقا و سالمیت کا ہے۔ خدانخواستہ اگر ملک کسی حادثے کا شکار ہو گیا تو نہ جانے ماندن نہ پائے رفتن کا مصداق ہو گا۔ جب تک ہمارا ملک ہمیں اپنی جان اور اپنے مفادات سے عزیز نہیں ہو گا اس وقت تک ملک کی سالمیت اپنوں اور بیگانوں میں موضوع بحث بنی رہے گی۔

وزیر اعظم بھٹو اگر ملک کی بقا چاہتے ہیں تو انہیں گروہی مفادات اور ذاتی خواہشات کو قومی امنگوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانا ہو گا۔ ورنہ محض نعروں، محض تقریروں، محض الزام تراشیوں اور غداری کے تمغے تقسیم کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ اسلام اور جمہوریت کے بغیر ملکی سالمیت و استحکام کی بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک ہی بہت ہیں گر کچھ اثر کریں!

ضروری اعلان

حضرت امیر مرکزیہ حضرت درخواستی مدظلہ مدظلہ، ان دنوں علاج کی غرض سے لاہور آئے ہوتے ہیں اور حاجی دست گیر صاحب کے مکان پر قیام فرما ہیں۔ تمام حضرات سے اپیل ہے کہ حضرت مدظلہ کی جلد صحت یابی کے لیے دعا کریں

جمعیۃ علماء اسلام لاہور

حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی کو سعودی عرب اور عرب امارات کے دورہ سے واپسی پر ۱۰/اپریل بروز جمعرات ۲ بجے دن مدرسہ قاسم العلوم اندرون شیرانوالہ گیٹ لاہور میں دعوت استقبالیہ دے رہی ہے جس میں حضرۃ مولانا عبید اللہ انور دامت برکاتہم بھی شریک ہوں گے مولانا چنیوٹی اسی روز مجلس ذکر کے بعد جامع مسجد شیرانوالہ میں اپنے دورہ کے تاثرات بیان کریں گے۔

توجہ فرمائیے
مفتی محمود کا دور حکومت
دوسرا ایڈیشن
اور
سید شمس الدین شہید رح شائع ہو گئیں
جلد طلب فرمائیے۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ افکار نو لوہاری دروازہ ملتان۔

مشرق و مغرب کی سیاست

جنوبی ویت نام اور امریکی امداد

[illegible]
ڈاکٹر
[illegible]
حسین
کمال

آج کل امریکی پریس اور امریکی کانگریس میں سائیگان کی خستہ حال حکومت کو سہارا دینے کے لیے مزید امداد دینے کے سلسلے میں جو بحث ہو رہی ہے وہ بنیادی طور پر یونان میں رونما ہونے والے واقعات سے متعلق امریکی پریس میں ہونے والی حالیہ بحثوں اور تبصروں سے ملتی جلتی ہے۔ اس وقت یونان میں جو فسطائی فوجی حکام برسر اقتدار تھے انہوں نے امریکہ کے متعلقہ شعبوں سے امداد دینے کی اپیل کی تھی۔

اس حقیقت سے پوری دنیا باخبر ہے۔ کہ پاپا دوپولوس، گیزیکیس اور اسی قبیل کے دیگر افراد نے ہولناک جرائم کا ارتکاب کیا اور صرف امریکی حمایت کے سہارے پر اقتدار پر قابض رہے، لیکن ان کا اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ بیرونی امداد سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، بلکہ وہ سیاسی اعتبار سے نااہل ثابت ہوئے اور اپنے ملک ہی میں مکمل طور پر الگ تھلگ ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی قبرص کی مہم سے ان کے اقتدار پر ایسی کاری ضرب پڑی کہ ان کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے۔

اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک غیر مقبول فوجی آمریت نہ تو فوجی امداد کے سہارے پر زندہ رہ سکتی ہے اور نہ مالی امداد ہی اس کے تن مردہ میں جان ڈال سکتی ہے۔ آج کل بعض ممتاز امریکی مبصر اور کانگریس کے اراکین فضول سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور اس امر پر غور و خوض کر رہے ہیں کہ سائیگان کی جابر اور رسوائے زمانہ حکومت کو کس قدر امداد دی جائے۔ امریکہ کے ان لوگوں نے جو سابق تو [illegible] کے آخری زمانے کے دوران حاصل ہونے والے تباہ کن نتائج کا اعادہ کرنا نہیں چاہتے سائیگان حکومت کو تاریخ کا کوڑے کا ڈھیر کہ کر علی الاعلان مسترد کر دیا ہے، لیکن ایونس اور نووک جیسے پرجوش جرنلسٹ بھی ہیں جو یہ غل غپاڑہ مچا رہے ہیں کہ تھیو کو ہر طرح کی امداد دی جائے۔

اس کے علاوہ امریکی سیاست دانوں اور جرنلسٹوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس سلسلہ میں درمیانی راستہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ ان کی پالیسی یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو تھیو کی زیادتیوں کو ناپسند بھی کرتے ہیں اور دوسری جانب وہ امریکی ٹیکس دہندگان کی قربانی دے کر تھیو حکومت کو مالی امداد دینے پر بھی آمادہ ہیں۔

اسی طرح بعض اراکین کانگریس نے مفاہمت کے سلسلے میں بھی دو رخی پالیسی اختیار کی ہوئی ہے۔ عوام میں تو وہ کھل کر مفاہمت کے ارفع ترین اصولوں کی حمایت کرتے ہیں لیکن ان کی سرگرمیاں ان اصولوں کے سراسر خلاف ہیں۔

گذشتہ سال موسم گرما میں امریکی کانگریس میں سائیگان کو مالی اور فوجی امداد دینے کے مسئلے پر بحث ہوئی اور بارہ مہینے کے لیے ۷۰ کروڑ ڈالر کی امداد دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ مدت جون ۱۹۷۵ء میں ختم ہوتی ہے۔

پچھلے سال تھیو حکومت نے جتنی امداد مانگی تھی اس کے مقابلے میں دو تہائی کم امداد دی گئی۔ لیکن ۷۰ کروڑ ڈالر بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ اب یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ کیونکہ تھیو حکومت کو اندرون ملک نئی مشکلات کا سامنا ہے اور اس کا زور ٹوٹتا جا رہا ہے۔ اس لیے سائیگان کو مزید ۳۰ کروڑ ڈالر کی امداد دی جائے۔

گذشتہ سال ماہ اکتوبر کے وسط میں پیرس کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ تعمیر نو اور ترقی کے بین الاقوامی بینک کے ایک اجلاس میں امریکہ کی پہل کاری پر سائیگان کو ۵۰ کروڑ ڈالر کا قرضہ دینے کے مسئلے پر بحث ہوئی لیکن فرانس، سویڈن، ناروے، اٹلی، برطانیہ، آسٹریلیا اور دیگر ممالک کے نمائندے تھیو حکومت کو اس قسم کا قرضہ دینے کے مخالف تھے۔

تاہم کسی ایسے منصوبے [illegible]

چاہتے جو ناکامی سے [illegible]

کے آغاز میں ویت نام میں [illegible]

جنگ زور پکڑتی جا رہی [illegible]

[illegible]

فراہم کرنے اور ویت نام کی جمہوری ری پبلک کی فضائی حدود کی خلاف ورزی جیسے اقدامات کیے گئے جو بظاہر غیر اہم نظر آتے ہیں۔

پچھلے دنوں امریکی وزیر دفاع نے واشنگٹن میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ تھیئو حکومت کو مادی اور فنی بنیاد کی ضمانت دینے کے لیے سائیگان کو اضافی امداد دینا بے حد ضروری ہے، لیکن ایسی حکومت کی کیا بنیاد ہو سکتی ہے جو خود ہی اپنے عوام کے خلاف لڑ رہی ہو؟

ایشیا میں امن و سلامتی کا مسئلہ

دنیا کا قدیم اور عظیم براعظم ایشیا ایک طویل عرصے تک سامراج کے نوآبادیاتی شکنجے میں جکڑا ہوا اور چھوٹی بڑی جنگوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ آج بھی اس براعظم کے مختلف حصوں میں جنگ وجدل، قتل وغارت گری کشیدگی اور محاذ آرائی کا سلسلہ جاری ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایشیا پر سے سامراج کا براہ راست سیاسی تسلط ختم ہو گیا اور متعدد نئے اور آزاد ممالک وجود میں آتے، لیکن سامراج نے جاتے جاتے ان نو آزاد ملکوں کے درمیان ایسے مسائل پیدا کر دیئے جو آج تک ان ملکوں کے درمیان وجہ نزاع بنے ہوتے ہیں۔ اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے ایشیائی ممالک وقتاً فوقتاً کوششیں کرتے رہے ہیں۔ ان کوششوں کا واضح اظہار افرو ایشیائی ملکوں کی نیڈ ڈگ کانفرنس سے خاص طور سے ہوا۔ نیڈ ونگ کانفرنس کے انعقاد اور اس کے اصولوں کی تدوین اور کامیابی میں عوامی جمہوریہ چین اور ہندوستان نے قابل ذکر کردار ادا کیا۔ کیونکہ انہی کے پیش کردہ پانچ اصول جو پنج شیلا کے نام سے مشہور ہوتے نیڈ ونگ کانفرنس کے اعلامیوں کی بنیاد بنے۔ یہ پانچ اصول جو بین الریاستی تعلقات میں طاقت سے گریز، ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت، ایک دوسرے کی سرحدوں، اقتدار اعلیٰ اور علاقائی سالمیت کے احترام اور مساویانہ بنیادوں پر باہمی طور پر مفید تعاون پر مبنی تھے۔ مختلف سماجی نظاموں کے حامل ملکوں کے درمیان پرامن بقائے باہمی کے لازمی اجزا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان اصولوں کو افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کی اکثریت اور سوویت روس کی حمایت حاصل تھی۔

نیڈ ونگ کانفرنس اور اس کے پیش کردہ اصولوں نے خاص طور سے ایشیائی ملکوں کے درمیان مفاہمت اور باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا جس کی بدولت بہت سے ایشیائی ملکوں کے لیے اپنے وہ علاقے جو سامراج کے قبضے میں تھے آزاد کرانا ممکن ہو گیا۔

جہاں تک سامراج طاقتوں کا تعلق ہے وہ تو روز اوّل ہی سے ایشیا میں پنج شیلا کی بنیاد پر تعاون اور مفاہمت کی مخالفت کر رہی تھیں، مگر ۱۹۶۰ء کے قریب خود ایشیا کی سرزمین میں بھی ایسے عناصر ابھرے جن کے اقدامات نے پنج شیلا کی روح کو مسخ کر دیا اور پرامن فضا کو ختم کر کے رکھ دیا۔

ایشیا میں مفاہمت تعاون اور سلامتی کی کوششوں کو اس وقت زبردست دھچکا لگا، جب ہندوستان اور روس کے ساتھ سرحدی تنازعات پر چین کا مسلح تصادم ہوا اور اس طرح ایشیا کے تین بڑے ممالک یعنی روس چین اور ہندوستان کے تعلقات جو اس براعظم میں قیام امن کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے تھے، کشیدگی اور تصادم کی نذر ہو گئے۔

بہرحال آج کی ایشیائی صورت حال میں امن اور سلامتی کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ غیر وابستہ ملکوں کی الجزائر کانفرنس، ایشیا میں سلامتی اور تعاون پر ہونے والی مئی ۱۹۷۳ء کی ڈھاکہ کانفرنس اور سمرقند کانفرنس میں ایشیائی رائے عامہ کے نمائندوں اور دانشوروں نے بھی اس براعظم سے غربت جہالت اور بیماریوں کے خاتمے اور لوگوں کے معیار زندگی میں اضافے کے لیے پرامن بقائے باہمی کے اصولوں کی بنیاد پر ایشیا میں امن، سلامتی اور تعاون کے فروغ کی ضرورت پر زور دیا ہے جس سے یہ توقع ظاہر ہو گئی ہے کہ ایشیا کا مستقبل امن، سلامتی اور تعاون کے فروغ سے وابستہ ہے اور بالآخر ان اصولوں کو فتح حاصل ہوگی جو نوع انسانی کے بہتر مستقبل کے امین ہیں۔

ماضی وحال

ایک نظر

آج سے تیس سال قبل ۴ فروری تا ۱۱ر فروری ۱۹۴۵ء کو یالٹا سے باہر قصر لوادیا میں تینوں اتحادی ممالک کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں سوویت یونین کی جانب سے جوزف و اسٹالن امریکہ کی جانب سے فرینکلن ڈ روز ویلٹ اور برطانیہ کی جانب سے ونسٹن چرچل نے شرکت کی تھی۔

اس کانفرنس کے نتیجے میں جو کریمیا کانفرنس کے نام سے موسوم ہے۔ مختلف سماجی نظاموں کی حامل ان ریاستوں کا سیاسی، اقتصادی اور فوجی باہمی تعاون ختم ہو گیا جو جرمن اور اطالوی فسطائیت اور ان کے یورپی اور مشرق بعید کے اتحادیوں کے خلاف عمل میں آیا تھا۔

اس وقت کی سیاسی اور فوجی صورت حال

کے پیشِ نظر اس کانفرنس کا انعقاد بے حد ضروری تھا۔ اس کانفرنس میں تینوں اتحادی طاقتوں کو اپنے مشترکہ دشمنوں، فسطائی جرمنی اور عسکریت پسند جاپان کو شکست دینے کے منصوبوں کو مربوط کرنا اور جنگ کے بعد پائیدار امن کے لیے اصول وضع کرنا تھا۔ سوویت یونین نے کانفرنس میں جنگ کے آخری مرحلے میں تینوں اتحادی طاقتوں کی مشترکہ فوجی کارروائیوں اور منصوبوں کی منظوری اور ہم آہنگی میں اپنا کردار ادا کیا۔

اس کانفرنس میں بہت سے اہم سیاسی فیصلے کیے گئے جن میں جرمن فوجوں میں کمی کرنے اور نازی ازم کا خاتمہ کرنے سے متعلق کیے گئے فیصلے غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے۔ تینوں طاقتوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ ہمارا مقصد جرمن عسکریت اور نازی ازم کا قلع قمع کرنا اور یہ ضمانت دینا کہ جرمنی آتندہ کبھی امن عالم کو تباہ کرنے کے قابل ہی نہ ہو سکے۔ اس کانفرنس میں کیے گئے فیصلے مابعد جنگ کے بند و بست کے اصولوں پر کیے گئے تھے۔ جو یوم فتح کے کچھ ہی عرصے بعد پوسٹڈم میں وضع کیے گئے تھے۔

کریمیا کانفرنس میں اقوام متحدہ کے قیام کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا جو ایک اہم ترین مسئلہ تھا۔ اس کانفرنس میں ایک نئے طاقت ور اور جمہوری پولینڈ کے قیام اور اس کی سرحدوں کے تعین کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔

آج پولینڈ کی مغربی سرحدوں سمیت یورپ کی موجودہ سرحدوں کو سوویت یونین اور مغربی جرمنی اور پولینڈ اور مغربی جرمنی کے مابین ہونے والے معاہدوں کے ذریعہ ناقابل الفاخ حیثیت مل چکی ہے۔

کانفرنس کے اعلان نامے میں بڑی طاقتوں اور تمام امن پسند قوموں کے درمیان باہمی تعاون اور مفاہمت کے اصول کو آئندہ پائیدار امن کے قیام کے لیے ایک شرط اولین قرار دیا گیا۔

کریمیا کانفرنس میں مشترکہ طور پر کیے گئے فیصلے اس بات کا اور ایک ثبوت ہیں کہ بین الاقوامی متنازعہ فیہ مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ فریقین ان کو حل کرنے کے خواہش مند ہوں۔ ان فیصلوں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ دو مختلف نظاموں کی حامل ریاستوں کے درمیان جنگ اور امن دونوں زمانوں میں باہمی تعاون کے تعلقات قائم کیے جا سکتے ہیں اور وہ مفید بھی ثابت ہوتے ہیں۔

لیکن جنگ کے بعد کے زمانے میں اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ ہٹلر کے خلاف اتحاد کے ڈھانچے میں باہمی تعاون کے دَور کے بعد سرد جنگ کا سنگین دَور آیا۔ سرد جنگ، کمیونزم دشمنی اور تجارتی تعلقات میں امتیازی سلوک کی پالیسی کے نتیجے میں مختلف سماجی نظاموں کی حامل ریاستوں کے درمیان سیاسی اور اقتصادی باہمی تعاون کو سخت نقصان پہنچا۔ آخری تجزیے میں یہ پالیسی ناقص ثابت ہوئی اور انجام کار ناکام ہو گئی۔

جمعیۃ طلبا اسلام سے متعلقہ تمام مضامین اور خبریں دفتر جمعیۃ طلبا اسلام ۵۶ میکلوڈ روڈ کے پتہ پر ارسال کریں۔ (ادارہ)

غرناطہ ریستوران ائیرکنڈیشنڈ جہلم
عمدہ ماحول
عمدہ سروس

حلیمہ ہوٹل
عمدہ اور لذیذ کھانے تناول فرمانے کے لیے تشریف لائیں
کسیرا بازار گوجرانوالہ

محمد یوسف لدھیانوی

دلائل کے انبار؟

اب بتاؤ کہ تمہارے "حضرت صاحب" کے خدا کا کلام باطل ہوا یا نہیں؟ اور جس خدا کا کلام ہی باطل ہو گیا اس کے اسلام کی صداقت پر "کتنا اعتبار" ٹک سکے؟ اب ذرا ورق الٹ کر صفحہ ۱۱۰ پر "حضرت صاحب" کی صداقت اسلام کی دلیل پڑھو جو جلی قلم سے لکھی ہوئی ہے، اور پھر انصاف سے کہو کہ "حضرت صاحب" کی اس "شیریں زبانی" کا حقیقی مصداق کون نکلا؟ "حضرت صاحب" فرماتے ہیں:

"خدا تعالیٰ کے غیر متبدل وعدے پورے ہو جائیں گے، کیا کوئی زمین پر ہے جو ان کو روک سکے؟ بدبخت انسان بدظنی کی طرف جلدی کرتا ہے اور حلیم طبیعت اور عمیق فکر کے ساتھ نہیں سوچتا۔ اے بدفطرتو! اپنی فطرتیں دکھلاؤ، لعنتیں بھیجو، ٹھٹھے کرو، اور صادقوں کا نام کاذب اور دروغگو رکھو، لیکن عنقریب دیکھو گے کہ کیا ہوتا ہے، تم ہم پر لعنت کرو تا فرشتے تم پر لعنت کریں، میں نے بہت چاہا کہ تمہارے اندر سچائی ڈالوں اور ناپاکی سے تمہیں نکالوں لیکن تمہاری بدبختی تم پر غالب آگئی، سو اب خوب جانو کہ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے، جب تک وہ دن نہ آوے کہ جو قادر کریم نے میرے دکھانے کے لیے مقرر کر رکھا ہے، ضرور تھا کہ تمہیں ابتلا میں ڈالے اور تمہاری آزمائش کرے، تا تمہارے جھوٹے دعوے فہم و فراست اور تقویٰ و علم قرآن کے تم پر کھل جائیں۔ یاد رکھو کہ عورت مذکورہ کے نکاح کی پیشگوئی اس قادر مطلق کی طرف سے ہے جس کی باتیں ٹل نہیں سکتیں"۔

خیر اس سلطان القلمی کا قصہ تو تم جانو یا تمہارے "حضرت صاحب" جانیں۔ ہم ان "مہذب الفاظ" سے کسی کو خطاب کرنا اپنے قلم کی توہین سمجھتے ہیں۔ مگر انصاف سے کہو آج تک "ابتلاء" اور "آزمائش" کس کے حصہ میں آئی ہے؟ اور آج تک کس کے "جھوٹے دعووں" کی قلعی کھل رہی ہے؟ کیا یہی ہے صداقت اسلام کے دلائل کا انبار جس پہ پیغام صلح کو ناز ہے؟

ہاں! صداقت اسلام کی دلیل کا ایک اور انبار بھی سنیے! "حضرت صاحب" نے "اشتہار انعامی چار ہزار روپیہ" میں تحریر فرمایا تھا:

"میں بالآخر دعا کرتا ہوں کہ اے خدائے قادر و علیم اگر آتھم کا عذاب مہلک میں گرفتار ہونا اور احمد بیگ کی دختر کلاں کا اس عاجز کے نکاح میں آنا یہ پیشگوئیاں تیری طرف سے ہیں تو ان کو ایسے طور ظاہر فرما جو خلق اللہ پر حجت ہو اور کور باطن حاسدوں کا منہ بند ہو جائے اور اگر اے خداوند یہ پیشگوئیاں تیری طرف سے نہیں ہیں تو مجھے "نامرادی" اور "ذلت" کے ساتھ ہلاک کر۔ اگر میں تیری نظر میں "مردود" اور "ملعون" اور "دجال" ہی ہوں جیسا کہ مخالفوں نے سمجھا ہے اور تیری وہ رحمت میرے ساتھ نہیں، جو تیرے بندہ ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اسمٰعیلؑ، یعقوبؑ، موسیٰؑ، مسیح بن مریم، خیر الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس امت کے اولیا کرام کے ساتھ تھی، تو مجھے فنا کر ڈال

> اور ذلتوں کے ساتھ تجھے ہلاک کر، اور ہمیشہ کی لعنتوں کا نشانہ بنا، اور تمام دشمنوں کو خوش کر اور ان کی دعا قبول فرما"
>
> (مجموعہ اشتہارات جلد دوم ص ۱۱۵ طبع جدید ربوہ)

اس پر ہم کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتے۔ لاہوری دوست آئینہ عبرت سامنے رکھ کر بتائیں کہ "احمد بیگ کی دختر کلاں کا اس عاجز کے نکاح میں آنا" کیا اس کی حقیقت وہی نہیں نکلی "جیسا کہ مخالفوں نے سمجھا تھا"؟ کیا حضرت صاحب کے کور باطن حاسدوں کا منہ بند ہو گیا؟ اور کیا مرزا صاحب کے معاملہ میں خلق اللہ پر حجت قائم ہو گئی۔؟

اب ایک تیسرا ارشاد بھی ملاحظہ کیجیے "حضرت صاحب" فرماتے ہیں:

> "میں بار بار کہتا ہوں کہ نفس پیشگوئی داماد احمد بیگ کی تقدیر مبرم ہے، اس کی انتظار کرو اور اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ پیشگوئی پوری نہیں ہوگی اور میری موت آجائے گی"
>
> (انجام آتھم ص۳۱ حاشیہ)

۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور والی جماعت کے "حضرت صاحب" کی موت آگئی۔ مگر احمد بیگ کا داماد قیام پاکستان کے بعد تک زندہ سلامت رہا؟

کیا ارشاد ہے، پیشگوئی پوری ہو گئی؟ اور پیشگوئی کا انجام سامنے آگیا یا ابھی کسی گوشے میں مخفی ہے؟ اب ذرا حضرت صاحب کے مندرجہ ذیل ارشاد کو پڑھ کر بتاؤ یہ "تحفے" کس کے حصے میں آئے؟ فرماتے ہیں:

> "سو چاہیے تھا کہ ہمارے نادان مخالف انجام کے منتظر رہتے اور پہلے ہی سے اپنی "بدگوہری" ظاہر نہ کرتے، بھلا جس وقت یہ ساری باتیں پوری ہو جائیں گی تو کیا اس دن یہ "احمق" مخالف جیتے ہی رہیں گے اور کیا اس دن یہ تمام لڑنے والے سچائی کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو جائیں گے ان "بیوقوفوں" کو کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں رہے گی اور نہایت صفائی سے ناک کٹ جائے گی اور ذلت کے سیاہ داغ ان کے منحوس چہروں کو بندروں اور سوروں کی طرح کر دیں گے۔"
>
> (ضمیمہ انجام آتھم ص۵۳)

کاش! قادیانی دوست انجام کے منتظر رہتے، اور پیش گوئی کے پورا ہونے سے قبل "حضرت صاحب" کو مامور من اللہ اور "صاحب وحی الٰہی" سمجھنے کی غلطی نہ کرتے تو آج ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ اپنے آئینے میں اپنا منہ دیکھو۔ آفریں ہے پیغام صلح کو کہ وہ اس آئینہ حقیقت نما میں "حضرت صاحب" کے ایک ایک خط و خال دیکھنے کے بعد بھی صداقت اسلام کے دلائل کا انبار دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ہمت کرتا ہے۔

ایک ظلم عظیم

مرزا صاحب کے "آئینہ حقیقت نما" کا ذکر آیا تو جی چاہتا ہے کہ قارئین کرام کو ختم نبوت کے ایک اعجازی پہلو کی طرف توجہ دلاؤں وہ یہ کہ یوں تو دنیا میں مختلف لوگوں کی پیش گوئیاں پوری ہو جاتی ہیں لیکن جب بھی کسی نے اپنی جھوٹی نبوت کے ثبوت میں تحدی سچائی اور معجزہ دکھانے کا دعویٰ کیا حق تعالیٰ نے کھلے بندوں اس کی تکذیب کر دکھائی اور اس کا سارا غرور خاک میں ملا دیا، کانا دجال مجددیت و نبوت سے گذر کر خدائی تک کا دعویٰ کر گیا، لیکن آنکھ سے کانا ہوگا اور ماتھے پر کافر لکھا ہوا ہوگا۔ وہ بیسیوں سخن سازیوں اور شعبدہ بازیوں سے دل کے اندھوں کو گمراہ کرے گا، لیکن اس کی کور چشمی اور پیشانی کی تحریر اس کی تکذیب کا اعلان کرنے کے لیے کافی ہوگی، اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص نقد ایمان اس کے ہاتھ پر گروی رکھے اور اس سخن سازیوں پر ایمان لائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس پر اللہ کی حجت قائم نہیں ہوئی؟

مرزا غلام احمد قادیانی نے جب بھی کوئی تحدی آمیز پیش گوئی کی یا معجزہ نمائی کا اعلان کیا حق تعالیٰ شانہ نے قدم قدم پر اس کی تکذیب و اہانت کے کھلے دلائل مہیا کر دیئے، مرزا صاحب نے مدۃ العمر ان خدائی دلائل پر تاویلات اور سخن سازیوں کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی، مگر کسی طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ راقم الحروف کے سامنے ان دلائل کا ایک دفتر موجود ہے جو حجۃ اللہ مرزا صاحب کی تکذیب پر قائم ہوئے مگر میں زیر قلم بحث کی مناسبت سے اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں:

مرزا صاحب نے ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء کے اشتہار میں محمدی بیگم سے نکاح کا تحدی آمیز اعلان جاری کیا تھا، جس کے مندرجات کا خلاصہ نمبروار یہ تھا:

۱— یہ نکاح آسمانی نشان ہوگا۔

۲— احمد بیگ کے لیے موجب برکت اور ایک رحمت کا نشان ہوگا۔

۳— مجھ سے نکاح نہ کیا تو لڑکی کا انجام نہایت ہی برا ہوگا۔

۴— جس سے بیاہی جائے گی وہ روز نکاح سے اڑھائی سال تک مر جائے گا۔

۵— لڑکی کا والد تین سال تک مر جائے گا۔

۶— ان کے گھر میں تفرقہ، تنگی اور مصیبت پڑے گی۔

۷— درمیانی زمانہ میں بھی اس لڑکی کے لیے بہت سے امر کراہیت اور غم کے پیش آئیں گے۔

۸— خدا نے یہ مقرر کر رکھا ہے کہ ہر ایک روک دور کرنے کے بعد انجام کار اس کو اسی عاجز کے نکاح میں لائے گا۔

۹— اس کے ذریعے بے دینوں کو مسلمان بنائے گا۔

۱۰— گمراہوں میں ہدایت پھیلائے گا۔

۱۱— مخالفوں کی روک دور کرنے کے لیے خدا تعالیٰ مددگار ہوگا۔

۱۲— انجام کار اس لڑکی کو تمہاری طرف واپس لائے گا۔

۱۳— خدا کی باتوں کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔

۱۴— تیرا رب قادر ہے۔

۱۵— وہ جو چاہے وہی ہو جاتا ہے۔

۱۶— خدا مرزا کے ساتھ ہے اور مرزا خدا کے ساتھ۔

۱۷— عنقریب تجھے مقام محمود ملے گا جس میں تیری تعریف ہوگی۔

شہید اور شہادت

محمد امین اختر

نیو ٹاؤن کراچی

حق کی راہ میں جو شخص اپنی جان جان آفریں کے سپرد کرے اور حق کو غالب لانے کی خاطر دشمنان حق کے ہاتھوں قتل ہو جائے شہید کہلاتا ہے۔ شہید یا تو مشہود سے ہے بمعنی حضور کے، یا مشاہدہ سے بمعنی معائنہ کے۔ یا شہادت سے بمعنی گواہی کے، ہر ایک کے لئے مؤید پایا جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فعیل کے وزن پر مصدر ہو، بمعنی شاہد یا مشہود کے، اسم اور مسمی میں یہ عجیب مناسبت ہے کہ جس طرح مسمی متضاد جہات کا حامل ہے اسی طرح اسم میں بھی متنوع احتمالات پائے جاتے ہیں۔

قتیل فی سبیل اللہ کو شہید کہنے کی کئی وجوہ ہیں۔

اولاً ــــ تو اسے شہید اس لئے کہا جاتا ہے کہ نزع روح کے وقت رحمت حق کے فرشتے اس کے پاس حاضر ہو جاتے ہیں تاکہ اس کے جسد پاک کو غسل دے کر روح مبارک کو فردوس بریں لے جائیں۔

ثانیاً۔ اس لئے کہ وہ مشہود لہ بالجنۃ ہے حق تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ بندے شہید کے جنتی ہونے پر گواہی دیتے ہیں۔

ثالثاً، ــــ اس لئے کہ دائمی آرام و سکون کی جگہ جنت میں جو فرودگاہ ہے اس کے لئے تیار ہے حالت نزع میں وہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

رابعاً ــــ اس لئے کہ اس کے پاکیزہ خون کا قطرہ قطرہ اور زخم خوردہ جسم کا ذرہ ذرہ اس کے کمال ایمان پر شہادت دیتا ہے

خامساً، اس لئے کہ بمقتضائے حدیث، حوران جنت نزع روح کے فوراً بعد جنتی لباس ہاتھوں میں لئے ہوئے اس کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں (یہ تمام وجوہ اس صورت میں ہیں، جب کہ فعیل بمعنے مفعول ہو)

سادساً، اس لئے کہ رضائے حق کی خاطر باطل کے سامنے سینہ سپر ہو کر جان دینے والا۔ خدا کی زمین پر خدا کی توحید کا سب سے بڑا گواہ ہے۔

سابعاً، اس لئے کہ شہید، شہادت کے بعد خدا کے ملک و ملکوت کا ہر آن مشاہدہ کرتا رہتا ہے

ثامناً، اس لئے کہ جس مشاہدے ہمت کے عشق سے سرشار ہو کر اس نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ شہادت کے بعد اس کی ابدی بعثت اور اس کے سامنے حضورؐ کا اعلیٰ مقام پا کر اس کے جہاں جہاں آرا کا بے حجاب مطالعہ کرتا ہے

عند ربہم، ای حاضرین عند ربہم و مقربین عندہ۔

تاسعاً، اس لئے کہ اسے اس مقدس محفل میں حاضری نصیب ہوتی ہے جس کے شرکا انبیاء کرام، صدیقین، صالحین ہوتے ہیں۔

عاشراً، اس لئے کہ اسے روز حشر احکم الحاکمین کی عدالت میں پیغام حق سے سرتابی کرنے والوں پر بطور گواہ پیش کیا جائے گا (یہ آخری وجوہ خمسہ شہید بمعنے شاہد ہونے کی صورت میں ہیں)۔

مندرجہ بالا تفصیل سے شہید اور شہادت کا رتبۂ عظمیٰ کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان و اسلام، اگر عشق خداوندی اور حب الٰہی اور اس کے مظاہر کا دوسرا نام ہے۔

تو شہادت فی سبیل اللہ اس الفت گاہ کے سلوک کی سب سے آخری منزل ہے۔ کسی مشاہدے کے محاسن و مکارم پر علم آنے کے بعد جب دل اس کا اسیر ہو جاتا ہے تو اوّلاً انسان جسم و لباس کی تطہیر کا سامان کر کے ان مقامات کو آنے جانے لگتا ہے جہاں اس پر محبوب کی نگاہِ خاص پڑنے کا امکان ہو اور وہ تمام آداب بجا لاتا ہے (نماز) جو اس کے مطلوب نظر عنایت کو اس کی طرف منعطف کرنے کا سبب بن سکتی ہوں۔ جب رفتہ رفتہ مرض عشق میں اضافہ ہونے لگتا ہے تو رضائے محبوب کی خاطر اپنے مال کو زکوٰۃ پر لگاتا ہے۔ جب اس جنون میں مزید کچھ اضافہ ہو جاتا ہے تو کھانا پینا چھوڑ بیٹھتا ہے اور تمام مخلوق سے کنارہ کش ہو کر ایک گوشے میں یار کے تصور میں گم ہو جاتا ہے، اور جب راہرو صحرائے عشق، اس منزل سے بھی ایک قدم آگے بڑھاتا ہے تو آبادیوں سے نکل کر ننگے سر، پا برہنہ بے آب و گیاہ وادی میں قدم رکھتا ہے اس "وادی غیر ذی زرع" میں اس کی نگاہ اپنے محبوب کے جلوہ گاہ پر پڑتی ہے، یہ دیوانہ وار اس کے ارد گرد چکر کاٹنے لگتا ہے اور اس کے در و دیوار کو چوم کر تسکین خاطر کی کوشش کرتا ہے مگر اس پر بھی سفرِ عشق کی انتہا نہیں ہوتی اس سفر کی آخری منزل تو یہ ہے کہ اپنی ہستی کو مٹا کر عاشق اپنے معشوق کی ذات میں فانی ہو کر دائمی وصال سے لطف اندوز ہو جائے۔ یہاں پہنچ کر وہ فزت و رب الکعبہ کا نعرۂ مستانہ لگاتا ہے۔

مذکورہ بالا اشارات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی اعمال و عبادات میں افضل ترین عمل وہ ہے کہ جس کا نتیجہ شہادت ہو جو کہ جہاد کا ثمر ہے اور حب الٰہی کے مظاہر میں سب سے ارفع و اکمل مظہر شہادت فی سبیل اللہ ہے حبّ الٰہی کے جھوٹے دعوے داروں سے اس لئے فرمایا گیا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا
اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ
لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ،
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ : اور
نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ

کہنے والوں نے ہزاروں سال پہلے حق تعالےٰ کے سچے پرستار حضرت موسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ

اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ
فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا
قٰعِدُوْنَ : کہہ کر اپنے جھوٹے ہونے

کا کھلا ثبوت پیش کیا تھا اس لئے آج بھی انکے حق میں یہ ارشاد گرامی سو فیصد سچا ہے کہ۔

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا
قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ۔

مومن اور کافر کے درمیان امتیاز ظاہر ہے اسی طرح صالح اور فاسق کے درمیان فرق کرنا بھی مشکل نہیں لیکن مومن اور منافق کے درمیان امتیاز کرنا انتہائی دشوار ہے یہ فرق اگر ہو سکتا ہے تو عملِ جہاد سے ہو سکتا ہے قرآن حکیم کی متعدد آیات اس کی طرف ہماری راہنمائی کرتی ہیں۔

در مدرسہ کس را نرسد دعویٰ توحید
منزل گہِ مردان موحد سرِ دار است

الغرض ذات حق کے ایک عاشق کے لئے شہادت سے زیادہ مرغوب اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی اس لئے کہ مقصد پا لینے کا یہ سب سے مختصر ترین راستہ ہے۔ الموت جسر
يوصل الحبيب الى
الحبيب : میں ایسی حقیقت کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان جب تک زندہ ہے تو وہ بشری تقاضوں سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ بقائے حیات اور جسمانی نشو و نما کے لئے بے شمار ضروریات کا فکر دامن گیر رہتا ہے۔

اس لئے اگر وہ چاہے بھی تو تب بھی حق تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ دنیوی، زندگی اس کے لئے حجاب مقصد ہے اور دنیا ایک قسم کا زندان ہے شہادت ہی کے ذریعہ سے یہ حجاب اٹھ سکتا ہے۔ اور یہ تمام بندھن، کٹ جاتے ہیں۔ اگر اعمالِ صالحہ کا ذخیرہ ہو تو طبعی موت سے بھی یہ مقصد ایک حد تک حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر اس میں وہ لذت کہاں جو لقائے دوست کے شوق میں، اس کی دوستی کے جرم اس کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دینے میں ہے ؎

بجرمِ عشق توام میکشند غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آ چہ خوش تماشائیست

سیاسی نقطۂ نظر سے بھی شہید اور شہادت کا مقام انتہائی اہمیت کا حامل ہے اس لئے دنیا کے ہر خطہ میں ہر قوم اس کے احترام کی قائل ہے۔ تاریخ عالم کے واقعات اپنی تواتر کے ساتھ گواہ ہیں آفرینش عالم سے کر آن حاضر تک دنیا میں کوئی تحریک، کوئی دعوت، کوئی انقلاب بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا جب تک کہ اس کی آبیاری انسانی خون سے نہیں کی گئی۔

حق تعالےٰ اگر کسی داعی کو خون کی قربانی پیش کرنے کے بغیر منزل مراد تک پہنچاتا تو حضور سرور انبیاء محبوب کبریا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقدس خون کے موتیوں سے احد و طائف کی سرزمین لالہ زار نہ ہوتی۔ اور نہ اپنے عظیم عم محترم اور دیگر جان سپار ساتھیوں کے اجساد مقدسہ کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھنا پڑتا

بہرحال دنیا کی کوئی تحریک بغیر قربانی کے، کامیاب نہیں ہو سکی اور نہ ہو سکتی ہے۔

لینن، ہٹلر، نیولین، وغیرہ نے ماضی قریب میں جو حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں ان کا اصل لم بھی یہی تھا کہ ان کے ساتھی فدائی، رفقائے کار جان نثار اور جان سپار تھے۔ مقصد کی خاطر مر مٹنے کا جذبہ ہی کامیابی کا ضامن ہے۔ یہی جذبہ عالمی برادری میں کسی قوم کو عزت و وقار کا مقام بخشتا ہے اور اس جذبہ سے محروم اقوام ذلت و پستی کی موت مرتی ہیں ؎

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ
اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ
تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ
اَلِيْمٍ۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ
وَاَنْفُسِكُمْ۔

میں خداوند علیم و حکیم نے اسی طرف حکیمانہ اشارہ فرمایا ہے۔ جان کی بامقصد قربانی وہ چیز ہے جو اقوام، جماعتوں اور تحریکوں کو زندگی بخشتی ہے۔

قرآن حکیم نے شہید کو میت کہنے ہی سے فقط نہیں روکا بلکہ اسے میت سمجھنے کی بھی ممانعت فرمائی ہے سیاسی طور پر اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فرد کی موت اگر جماعت کی حیات کا سبب بنتی ہے تو ایسی موت پر جوہر عمل سے محروم ہزاروں زندگیاں نثار ہوں۔ ایک فرد نے بظاہر اگر اپنا خون کسی سنگلاخ زمین پر بہایا مگر درحقیقت وہ قوم کے جسد اجتماعی میں جذب ہو کر گردش کرنے لگا تو اسے میت سمجھنا اعلیٰ درجہ کی حماقت ہے۔ اس خون سے جب ایک فرد متحرک تھا، ایک دل دھڑک رہا تھا تو "حیاۃ" کہلائے اور جب اس سے ہزاروں لاشیں حرکت میں آئیں اور ہزاروں دل حرارت پا کر دھڑکنے لگے تو "مماۃ" ٹھہرانا سطحی بینی کی انتہا ہے۔

شہید کی شہادت دراصل جماعت کی کامیابی

کی ضمانت ہے جس مقصد کی خاطر شہید نے اپنی جان دے دی ہے اس مقصد کے لئے کی جانے والی جد و جہد کے بار آور ہونے پر قوی و قادر پروردگار خود گواہی دیتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰہِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَہُمْ

شہید اپنے لہو سے قوم و جماعت کی راہنمائی کے لئے چراغ ہدایت روشن کر رہا ہے۔ اس کا بظاہر خاموش جسم اپنی قوم کے لئے مجسم دعوت عمل بنتا ہے اس کی قربانی کے تصدق قوم اپنی منزل مقصود تک رسائی پاتی ہے سیہدیہم کے الفاظ میں یہی نوید سنائی گئی ہے۔ شہید نے اپنے سینہ پر جو زخم کھائے ہیں وہ اس کی قوم کے زخموں کے لئے مرہم کی جگہ لیتے ہیں۔ اور جماعتی اصلاح کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وَیُصْلِحُ بَالَہُمْ۔ اور اسے خود قرب الٰہی کی منزل تک پہنچنے اور اپنے رب کریم کی کلی خوشنودی حاصل ہونے کے لئے مقام میں داخل ہونے کی انتظار نہیں کرنی پڑتی وَیُدْخِلُہُمُ الْجَنَّۃَ عَرَّفَہَا لَہُمْ۔

قرآنی تعلیمات اور رسول عربی فداہ نفسی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات پر غور کرنے کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شخص مومن ہو ہی نہیں سکتا اگر اس میں انقلابی جذبہ نہیں اور موت کی تمنا نہیں۔ خدا کے قانون کو خدا کی مخلوق پر نافذ کرنے کے لئے جد و جہد کرنا جہاد فی سبیل ہے۔ اور قتال اس کی انتہا اور [illegible] ہے اور اس میں کام آجانا شہادت ہے۔ قرآن کریم نے ان ہی دو چیزوں کو مومن کا نصب العین بتلایا ہے۔

ان اللہ اشتری من
المومنین انفسھم و
اموالھم بان لھم
الجنۃ یقاتلون فی سبیل
اللہ فیقتلون و
یقتلون۔

امت کے زوال پر جس قدر غور کیا جائے تو سبب یہی نظر آئے گا کہ اس میں انقلابی اسپرٹ نہیں رہا۔ اپنے اسلاف کی طرح موت سے کھیلنے کے بجائے، یہود و ہنود کی طرح موت سے ڈرتے ہیں اب بھی عروج و ارتقاء کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی روش بدلیں۔ اپنی زندگی کے خاکہ میں جہادی رنگ بھر کر اور قومی مزاج میں جذبۂ شہادت کی حرارت پیدا کر کے ہم پھر سے اپنا مقام پا سکتے ہیں اور دنیا کی امامت و قیادت کے موروثی منصب پر فائز ہو سکتے ہیں۔

حق تعالیٰ نے نظام حیات کے لئے جیسے کچھ تشریعی اصول ہمیں عنایت فرمائے ہیں اسی طرح اس ذات حق نے نظام کائنات کے لئے کچھ تکوینی اصول رکھے ہیں جو ناقابل تبدیلی اور ناقابل تنسیخ ہیں

"لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ
تَبْدِیْلًا"۔

یہ فطری ضوابط اور تکوینی اصول زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہیں کسی خطہ، کسی دور اور کسی نسل، کسی قوم کے ساتھ ان کی خصوصیت نہیں ہے۔ حتی کہ ایمان و کفر کا بھی ان کے سامنے کوئی امتیاز نہیں۔ ان ہی اصولوں میں سے ایک اصل اصول یہ ہے کہ دنیا میں کامیابی و کامرانی کا مدار انقلابی جذبہ، عمل کی ضرورت موت کی تمنا پر ہے۔

یہ صفات روسیوں میں آئے تو دنیا میں ممتاز مقام حاصل کیا، افیون خور چینیوں نے ان اصول کو اپنایا تو عالمی برادری میں احترام کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ مشرق کے بعض نحیف الجسم، کوتاہ قد، قوموں میں یہ جذبہ پیدا ہوا تو ایسی حکومتوں کو ہزیمت سے دوچار کیا کہ جو اپنے آپ کو ناقابل شکست، ناقابل تسخیر تصور کرتی تھیں۔ ہمارے عرب بھائیوں کے روایات عظمت پر چند سال پہلے جو دھبہ لگا تھا اسی جذبہ کے اعجازی اثر سے مہینوں نہیں ہفتوں نہیں، چند لمحوں میں اس کا ازالہ ممکن ہوا، اور انہوں نے آج دنیا میں بین الاقوامی سطح پر وہ مقام کیا جو ہر قسم کی ڈپلومیسی کے طریقے استعمال کر کے بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف اور صرف ان ہی اصولوں کو اپنا کر اور شعار بنا کر موجودہ ذلت و پستی کی گہرائیوں سے نکلنا ممکن ہے۔ اور ایمان باللہ، اور اعمال صالحہ کے زیور سے اگر آراستہ ہوں تو اخروی نجات و راحت بھی حاصل کی جا سکتی ہے

رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً
وَّھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا

بقیہ : شاہ فیصل کا قاتل کون

۴۔ مجرم ہسٹریا کا مریض بھی بتایا جا رہا ہے۔ لہذا قتل کے بعد اسے پاگل قرار دے کر نفوس خون کو انفرادی فعل کی قبا میں چھپانے کے چانس موجود تھے۔ چنانچہ ایسا کیا گیا اور سعودی عرب کی گورنمنٹ ابھی تک اس بات پر مصر ہے کہ قاتل پاگل تھا جب کہ قاتل کا استاد اور کولوریڈو یونیورسٹی امریکہ کے پروفیسر سام ذاکھم کے مطابق "قاتل فیصل بن مساعد" اور "سیاسی مفکر فیصل بن مساعد" دو متضاد باتیں ہیں۔ ڈاکٹروں کی رپورٹ قاتلوں کو صحیح الدماغ قرار دیتی ہے۔ اور قاتل کی کلاس فیلو اور دوست مس کرسٹائن سرا اسے پاگل قرار دینے پر تیار ہی نہیں۔

۵۔ قاتل کے بھائی کو دو سال قبل ٹیلیویژن کے اجراء کی مخالفت کی وجہ سے قتل کیا گیا تھا لہذا انتقام کی آگ بھڑکا کر قتل کے اقدام کو انتقامی فعل گردانا جا سکتا ہے۔

یہ اور ایسے کئی سربستہ [illegible] ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر شہزادہ فیصل کا انتخاب عمل میں لایا گیا ہو اس انتخاب میں ہو سکتا اقتدار کے خواہاں شہزادوں کا بھی ہاتھ ہو۔ بہرحال دنیائے اسلام کا عظیم سانحہ امریکی سامراج کی ایک خوفناک [illegible]

نمائندۂ خصوصی

اسلام آباد کے دو علما کا اغوا

اسباب ، حالات ، اثرات

علمائے دیوبند کا قافلہ ایک ایسا گروہ ہے کہ جو ہمیشہ سے کلمۂ حق کہنے کے جرم میں شہادت، کالا پانی کی عمر بھر قید، جلا وطنی، جیل کی طویل قید، نظر بندی، زبان بندی وغیرہ کی سزائیں برداشت کرتا چلا آیا ہے لیکن آج تک کسی قسم کی سخت سے سخت سزا اس گروہ کے کسی بھی فرد کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکی۔ انگریزوں سے لے کر آج تک کے ظالم حکمرانوں نے ان علمائے کرام پر اپنے ظلم و تشدد کا آخری وار تک آزمایا لیکن انہیں کلمۂ حق کہنے سے باز رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

موجودہ برسرِ اقتدار طبقہ نے بھی چھوٹی چھوٹی سزاؤں سے لے کر مولانا شمس الدین شہیدؒ کی شہادت تک کی سزا علمائے دیوبند کو پہنچائی لیکن ہر ایسی حرکت کے بعد خود ان کو ہی ذلیل و رسوا ہو کر جھکنا پڑا جس کی ایک زندہ مثال تحریک ختمِ نبوت کی کامیابی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ موجودہ اربابِ اقتدار علمائے حق کے اس گروہ کی ان خصوصیات سے آگاہ ہوتے ہوئے انہیں مزید نہ آزماتے۔ لیکن اپنے ناعاقبت اندیش پیشروؤں کی طرح غالباً یہ بھی اپنے اقتدار کے آخری دن تک اس گروہ کو نئے نئے طریقوں سے آزماتا رہے گا اور علمائے حق کا یہ عظیم قافلہ تاریخ کے ہر دور میں مصائب سہنے کے باوجود اپنے عزم و استقلال کی عظمت کا پرچم لہراتا ہی چلا جائے گا۔

حال ہی میں اس قافلہ کے دو نوجوان علماء دین اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مرکزی دار الحکومت کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب مولانا محمد عبداللہ صاحب اور جامع مسجد الفلاح اسلام آباد کے سابق خطیب مولانا محمد رولیس جان نسیم کو اغوا کر کے شہید کر دینے کی دھمکیاں دے کر اور تشدد کر کے آزمایا گیا ہے اور نتیجۃً صرف خود ہی نہیں بلکہ پوری مملکت پاکستان کو ذلیل و خوار کیا گیا ہے۔

میں اس واقعہ کے اسباب، حالات اور اثرات کو عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ حقائق سامنے آجائیں۔

۱۳، مارچ یعنی اغوا کیے جانے کے دن سے قبل ہونے والے جن واقعات و حالات کا تعلق اس واقعہ سے جوڑا جا سکتا ہے اور مولانا عبداللہ صاحب نے رہائی پانے کے بعد جلسہ عام اور پریس کانفرنس میں جو حالات بیان کیے ہیں ان کی روشنی میں جو اسباب سمجھ میں آسکتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ تحریک ختمِ نبوت کے دوران مولانا عبداللہ اور مولانا محمد رولیس خان کا مثالی کردار اور اسلام آباد کے عوام کی ان سے والہانہ عقیدت و محبت جس کی وجہ سے مرکزی مسجد میں مولانا محمد عبداللہ کے سوا کسی خطیب کو قبول نہیں کیا گیا۔

۲۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کا مرکزی جامع مسجد اسلام آباد میں کبھی کبھی جمعہ کا خطبہ دینا اور فروری میں مفتی صاحب کا از خود جمعہ کا وقت تبدیل کرنا اور مولانا کا اس کے مطابق عمل کرنا

۳۔ مارچ میں ہی بحریہ کے سربراہ ایچ ایچ احمد کا جنازہ نہ پڑھانا جب تک اس کے متعلقین تحریراً یہ حلفیہ بیان نہ دیں کہ وہ مرزائی نہیں تھا۔

۴۔ مجلس عمل تحفظ ختمِ نبوت کے ہنگامی اجلاس میں ایچ ایچ احمد کا جنازہ پڑھانے والے امام سے باز پرس اور آئندہ کے لیے اصول وضع کرنا

۵۔ وزیر اعظم بھٹو کے دورہ امریکہ کے موقع پر صدر فورڈ کے ساتھ بیگم نصرت بھٹو کے مبینہ رقص کے بارے میں ایک اعتراض فوٹوسٹیٹ کا اسلام آباد میں تقسیم ہونا اور اس کے بارے میں بعض ذمہ دار عناصر کا مولانا موصوف سے استفسار۔

اغوا کے حالات مولانا محمد عبداللہ کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں جو پریس کانفرنس میں تحریراً" تمام نمائندوں کو دیئے گئے لیکن ایک دو کے سوا کسی اخبار نے شائع نہیں کیے۔ مولانا محمد رولیس خان نسیم نے بھی "رہائی" کے بعد لاہور میں حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہٗ کے ساتھ پریس کانفرنس میں اغوا کی تفصیلات بتائیں جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکیں۔

مولانا عبیداللہ فرماتے ہیں کہ "۱۳، مارچ بروز جمعرات شام پونے پانچ بجے ایک شخص نے مجھے گھر سے باہر بلایا اور کہا کہ آپ سامنے کھڑی ہوئی کار تک چلیں ایک بات کرنی ہے۔ یہ کار سفید سے رنگ کی تھی اور سڑک پر مغرب کی جانب رخ کیے کھڑی تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ جس شخص نے مجھے بلایا تھا اس نے کہا کہ صوفی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ سیٹ پر بیٹھ جائیں۔ جب میں بیٹھا تو وہ شخص بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا اور ڈرائیور نے فوراً کار چلا دی۔ اس پر مجھے خطرہ محسوس ہوا تو میں نے شور مچایا تو انہوں نے کپڑے سے میرا منہ بند کرنا چاہا۔ میں نے مزاحمت کی اور ہاتھ پاؤں مارے جس سے اگلی سیٹ کا پیچھے کا حصہ پھٹ گیا۔ اس پر انہوں

نے مجھے ریوالور سے مارا اور جان سے مارنے کی دھمکی دی اور مجھ پر کمبل ڈال کر بے بس کر دیا۔ اس کشمکش میں کار اسلام آباد سے نکل چکی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق کار لاہور کی جانب چل رہی تھی جبکہ انھوں نے مجھے یہ تاثر دیا تھا کہ ہم اٹک کی جانب چل رہے ہیں (اس بات کی تصدیق ایک شخص کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس نے پولیس کو بتایا تھا کہ اس وقت میں نے اومنی بس میں بیٹھے ہوئے ایک کار دیکھی تھی جس پر نمبر پلیٹ نہیں تھی اور وہ ٹریفک کا اشارہ بند ہونے کے باوجود تیزی سے چوک میں سے گزر گئی تھی اور لاہور روڈ پر روانہ ہو گئی تھی۔ اس میں پچھلی سیٹ پر درمیان میں بیٹھے ہوئے شخص پر کمبل پڑا ہوا تھا۔) تقریباً دو ڈیڑھ گھنٹے کے بعد انہوں نے اسی حالت میں مجھے کار سے اتار کر ایک جیپ میں سوار کیا اور میرے ہاتھ، پاؤں اور کمر کو باندھ کر پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔

راستے میں میں نے اسی حالت میں اشارے سے عصر اور مغرب کی نماز ادا کی۔ اسلام آباد سے چلے ہوئے تقریباً پانچ گھنٹے کے بعد مجھے جیپ سے اتار کر ایک بند کمرے میں لے جایا گیا اور یہاں ہاتھوں کو کمر کے پیچھے باندھ کر چار مسلح نوجوانوں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ جن کے پاس ریوالور، ڈنڈے تھے۔ میرے خیال میں یہ بند کمرہ لاہور شہر کی کوئی جگہ تھی جب کہ انہوں نے مجھے کہا کہ تم سرگودھا شہر میں ہو۔ اس لیے کہ پہرے داروں نے انجانے میں آپس میں بات کی تھی کہ آج مولانا کوثر نیازی یہاں آئے ہیں اور مولانا موصوف اس دن (یعنی ۱۳، مارچ) لاہور میں تھے۔ یہاں میرے ہاتھ بندھے رہے اور میں اسی حالت میں نماز پڑھتا تھا۔ جبکہ کھانا وہ اپنے ہاتھ سے مجھے کھلاتے تھے۔ انہوں نے پہلے مجھے دھمکیاں دیں کہ ہم جو کچھ پوچھیں وہ سچ سچ بتانا ورنہ ہم تمہیں جان سے مار دیں گے یا بجلی کا کرنٹ لگائیں گے۔ اس کے بعد پوچھا کہ تم کون سی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہو اور مفتی محمود سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں اللہ رسول کی پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں اور مفتی محمود صاحب میرے بزرگ ہیں میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے کہا کہ تم نے بھٹو صاحب کو بدنام کرنے کے لیے کچھ کام تو نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ میں کسی آدمی کی تعریف یا توہین سے الگ رہتا ہوں اور صرف قرآن وحدیث کی بات مسجد میں کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے اسلام آباد تقسیم ہونے والی فوٹو اسٹیٹ کاپی کے بارے میں پوچھا کہ اس سے تمہارا کیا تعلق ہے کیا یہ کام تم نے کیا ہے؟ اگر تم نے نہیں کیا تو بتاؤ کس نے کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں ایسے کام کو ایک برائی سمجھتا ہوں اور اس کو روکنے کی کوشش کرتا ہوں تو میں خود ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں اور نہ ہی مجھے علم ہے کہ یہ کام کس نے کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آئندہ دو تین دنوں میں تم کیا کرنے والے تھے اور اس کے لیے کیا منصوبہ بنایا تھا۔ میں نے کہا کہ میرا کوئی اس قسم کا پروگرام نہیں تھا۔

اس دوران انہوں نے مجھ سے جبراً دو حلفیہ بیان لکھوائے ایک یہ کہ "میں آئندہ سربراہ مملکت اور ان کی کابینہ کی شان میں کوئی گستاخی اور ناشائستہ بات نہیں کروں گا اور اب تک جو کیا ہے اسکی معافی چاہتا ہوں۔"

دوسرا یہ کہ میں اپنی مرضی سے سرگودھا اپنے ذاتی کام کے لیے آیا تھا اور مخالفین نے گھر والوں کو پریشان کرنے کے لیے اغوا کی خبر شائع کرائی ہے۔ یہ مضمون انہوں نے چیف ایڈیٹر نوائے وقت کے نام لکھوایا (مولانا سے پریس کانفرنس میں نمائندہ نوائے وقت نے سوال کیا کہ آپ نے سرگودھا سے ہمیں ٹیلیفون کیا تھا۔ مولانا نے کہا کہ میں تو لاہور میں ان کی حراست میں تھا۔ ٹیلیفون کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نمائندہ نے بتایا کہ ہمیں کل سرگودھا سے ٹیلیفون آیا تھا کہ مولوی عبداللہ بول رہا ہوں اور خیریت سے ہوں یہ خبر شائع کر دو۔)

انہوں نے مجھے یہ بھی کہا کہ تمہاری طرح مولوی رولیس خاں (مولانا اسلام آباد میں خطیب ہیں اور حکومت آزاد کشمیر کی طرف سے میرپور میں مفتی ہیں) بھی ہماری حراست میں ہے اور تمہاری پارٹی کے دوسرے آدمیوں کو بھی اسی طرح حراست میں لیا جائے گا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا رولیس خان کو بھی جمعہ کی صبح اسی جیپ میں اسلام آباد سے اغوا کر کے اسی مکان میں لایا گیا اور ایک دوسرے کمرے میں بند رکھا گیا اور دوسرے دن ہفتہ کی رات شاہدرہ کے قریب چھوڑ دیا گیا۔)

دوسری رات کے دو بجے تک مجھے اسی کمرہ میں رکھا گیا۔ ہاتھ پیچھے بندھے رہے۔ اس دوران ان کی حرکات سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ مجھے قتل کر دیں گے اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ آخری وقت آ گیا ہے تو میں بالکل مطمئن ہو گیا تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ یہ دعا مانگتے رہتے تھے کہ اے اللہ شہید کی موت نصیب فرمانا۔ شاید یہ دعا قبول ہو گئی ہے البتہ یہ ڈر ضرور تھا کہ کتنے ہی حقوق اللہ اور حقوق العباد میرے ذمہ رہ گئے ہیں۔ خدا سے دعا کی کہ اے اللہ میرے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کرنا حساب نہ لینا۔ اسی دوران ان میں سے ایک نے دوسروں کو اشارہ کیا کہ سامان لے آؤ اس کی داڑھی مونڈھ دیں میں نے خدا سے دعا کی کہ اے اللہ میں اپنا پورا جسم تیرے حوالے کرتا ہوں۔ داڑھی کے بال بھی اب تیرے ہیں۔ یہ تیرے پیارے حبیبؐ کی سنت ہے اس کی حفاظت تیرے ہی ذمہ ہے یہ میرے ساتھ جو معاملہ بھی کریں گے میں تو تیرے ہی حوالے ہوں تو ان پتھر دلوں کے دلوں کو نرم کر دے۔ یہ دعا میں نے نوافل پڑھ کر کی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو نرم کر دیا تھا اور وہ اس مکروہ ارادے سے باز رہے۔

دوسری رات گیارہ بجے انہوں نے مجھے کہا کہ آج ہم تمہیں چھوڑ دیں گے اور اگر آئندہ تم نے گڑبڑ کی تو ایک دو تین کر کے تمہیں گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ اس دن انہوں نے میرا ایک شخص سے تعارف کرایا کہ یہ سرگودھا پیپلز پارٹی کے چیئرمین صاحب ہیں۔ اس شخص نے مجھے کہا کہ ہم سب پیپلز پارٹی کے ورکر

ہیں سرکاری ملازم نہیں ہیں۔ رات دو بجے انہوں نے مجھے باندھ کر ایک کار میں ڈالا اور پانچ بجے تک سفر کرنے کے بعد ایک سنسان جگہ پر سڑک کے کنارے کار کھڑی کر کے مجھے اتارا اور ایک گڑھے میں بٹھا کر مجھ پر چادر ڈال دی اور کہا کہ پانچ منٹ کے بعد اٹھنا ورنہ گولی مار دیں گے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں اٹھا اور سڑک پر ایک روشنی کی جانب چل دیا۔ دو تین فرلانگ پر یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی میں نے اس میں صبح کی نماز ادا کی اور معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہ جگہ سویاوہ ہے جو منڈی بہاؤالدین سے چار میل دور ہے اور یہاں سے ایک سڑک سرگودھا کو اور ایک پھالیہ کو جاتی ہے۔

یہاں سے میں جی۔ ٹی۔ ایس کی بس نمبر ۷ ۱۱ RID پر بیٹھ کر راولپنڈی پہنچا اور تقریباً ساڑھے دس بجے گھر پہنچ گیا۔ واپسی میں چونکہ میرے پاس کرایہ نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے مجھے بیس روپے کرایہ کے لیے دیئے اور وہ چادر بھی میرے پاس ہے جو انہوں نے مجھ پر دی تھی۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اپنے ساتھ پیش ہونے والے معاملے پر اُن افراد کو معاف کر دینا چاہتا ہوں۔ لیکن اس بنا پر ان افراد کو گرفتار کر کے سزا دینے کا مطالبہ کرتا ہوں تاکہ اس قسم کے واقعات دوبارہ نہ ہوں۔ علماء کرام کی توہین نہ ہو اور شریف لوگوں کی جان و مال محفوظ رہ سکے۔ نیز اس واقعہ کے پس پشت کارفرما عوامل کی تحقیق کر کے اصل حقائق سے عوام کو آگاہ کیا جائے تاکہ غلط فہمیاں ختم ہو سکیں اور اصل محرکات کا پتہ چل جائے۔"

یہ تو مولانا کا اپنا بیان تھا۔ ان دو دنوں میں انتظامیہ کیا رہا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱۳، مارچ کو رات نو بجے کے قریب اسلام آباد پولیس کو رپورٹ درج کرائی گئی۔ ڈی، ایس پی وغیرہ کو ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع دے دی گئی۔ دوسرے دن صبح راولپنڈی اور اسلام آباد کے علماء نے میٹنگ کر کے ایک وفد کی تشکیل کی جس نے مقامی انتظامیہ کے تمام ذمہ دار افسروں سے ملاقات کر کے صورتحال بتائی اور مولانا کی برآمدگی کے لیے کارروائی تیز کرنے کا مطالبہ کیا۔ جمعہ پر بھی اسلام آباد اور راولپنڈی کے تمام علماء نے مولانا کے اغوا پر غم و غصہ کا اظہار کیا اور مولانا کی فوراً برآمدگی کا مطالبہ کیا۔ لیکن اس سب کے باوجود جمعہ کی رات تک پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی اور کسی جگہ چھاپہ نہیں مارا۔ بلکہ مختلف طریقوں سے ٹالتے رہے۔ عوام میں مختلف "تاثرات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن عوام کی اکثریت یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ کارروائی حکمران طبقہ کی ہے۔ ۱۵، مارچ کو صبح پھر علماء راولپنڈی و اسلام آباد، تاجر حضرات و طلباء کے نمائندوں کا اجلاس ہوا اور احتجاجی ہڑتال اور جلسے جلوسوں کا پروگرام بنایا۔ پریس کانفرنس بھی بلائی تاکہ مولانا کے اغوا کے اسباب بیان کیے جائیں لیکن ابھی اجلاس جاری تھا کہ مولانا عبداللہ صاحب تشریف لے آئے۔ اسی وقت مرکزی مسجد میں ایک عظیم اجتماع ہو گیا اور مولانا نے اپنے ساتھ ہونے والے واقعات بیان کیے۔ اس وقت عوام میں غم و غصہ کے جذبات قابل دید تھے۔ عوام غم و غصہ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رو بھی رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ حکمران طبقہ کے خلاف نفرت اور غصہ کا اظہار بھی کر رہے تھے۔

آخر میں اس بات کا جائزہ لینا چاہتا ہوں کہ اس پوری کارروائی کا اثر کیا پڑا۔ عوام میں حکومت وقت کے خلاف نفرت کے جذبات میں اضافہ ہوا اس لیے کہ مرکزی دارالحکومت اسلام آباد سے دن دہاڑے مرکزی مسجد کے خطیب کا اغوا ہونا اور کار کا بغیر کسی رکاوٹ کے اسلام آباد سے نکل کر لاہور تک پہنچنا۔ جبکہ اسلام آباد میں ہر چوک میں پولیس تعینات ہے حفاظتی اقدامات ہیں اور جبکہ لاہور تک جگہ جگہ گاڑیوں کی چیکنگ ہوتی ہے اس کار کو کہیں نہیں روکا جاتا۔ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ اس میں کسی بااثر شخصیت کا ہاتھ ہے اور پہلے سے اس کے انتظامات کیے گئے ہیں۔

پورے عالم اسلام میں پاکستان ذلیل ہوا اس لیے کہ تمام سفارت خانے اسلام آباد میں ہیں اور عالم اسلام کے نمائندے مرکزی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں اور مولانا سے متعارف ہیں۔ کیا وہ سب اس واقعہ سے بے خبر ہوں گے؟ اور اس واقعہ سے انہوں نے کیا تاثر لیا ہو گا۔ اسی طرح باقی ممالک کے سفراء اسلام آباد میں رہتے ہوئے اس واقعہ سے کیا نتیجہ اخذ کریں گے۔

اسی طرح جس فوٹو سٹیٹ کے سلسلے کا سراغ لگانے کے لیے کوشش کی گئی اس واقعہ سے اس کی مزید اشاعت ہوئی اور جن لوگوں کو خبر نہیں ان کو بھی علم ہو گیا اور جس شخصیت کی عزت بچانے کی کوشش کی گئی وہ اور زیادہ ذلیل ہوئی۔

البتہ اس واقعہ سے جو خوشگوار اثر پڑا ہے وہ یہ ہے کہ علمائے دیوبند کے متعلقین کے عزم و استقلال میں اور اضافہ ہوا ہے اور ان کی روشن ماضی کے واقعات میں ایک واقعہ کا اضافہ ہو گیا ہے اور اسلاف کی قربانیوں کی یاد تازہ ہوئی ہے۔ اسی طرح خدائے ذوالجلال نے مولانا کو مصائب میں مبتلا کر کے ان کے درجات کو بھی بلند کر دیا ہے۔

النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم
لاکھ ستارے ہر طرف ظلمت شب جہاں جہاں
ایک طلوع آفتاب، دشت و چمن سحر سحر
تحریر: سید مناظر احسن گیلانی
سیرۃ النبیؐ پر تاریخ کی سب سے جامع لیکن مختصر کتاب
مولانا اشرف علی تھانوی: مناظر احسن کے سارے مناظر احسن ہیں۔
مولانا ابوالکلام آزاد: اس ایجاز و اختصار کے ساتھ سیرۃ پر اتنی جامع اور عمدہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری
علامہ شبیر احمد عثمانی: "النبی الخاتم" کے مطالعہ سے سیرت نبویؐ کے کئی نئے پہلو سامنے آئے۔
سید سلیمان ندوی: مناظر اسلام، متکلم ملت، سلطان القلم کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے
سید عطاء اللہ شاہ بخاری: "النبی الخاتم" کے ساڑھے چار سو عنوانات میں سے ہر عنوان پر ہفتہ بھر تقریر کر سکتا ہوں
مولانا سید محمد داؤد غزنوی: صرف "النبی الخاتم" کا مطالعہ سیرت کی بڑی اور ضخیم کتابوں پر بھاری ہے۔
مولانا ابوالحسنات: "النبی الخاتم" عشق و محبت اور واردات و کیفیات پیدا کرنے میں عجیب اثر رکھتی ہے
مولانا عبدالمجید قریشی: سیرت کی لائبریری میں اس قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔
مولانا محمد منظور نعمانی: دریا بکوزہ کی مثال دنیا کی کسی کتاب پر اس سے بہتر طور پر صادق نہیں آتی۔
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبویؐ میں "رحمۃ للعالمین" اور "النبی الخاتم" سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی۔ کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے۔
عبدالماجد دریابادی: ان کی ہر تحقیق میں قدامت کا استناد ہے اور ہر تعبیر میں جدت کی تازگی۔ یہ عجیب حکیمانہ امتزاج ہے اور ان کی فضیلت کا طرۂ امتیاز۔ قیمت قسم اول ۱۲ روپے۔ قسم دوم [illegible] روپے
"النبی الخاتم" معنوی خوبیوں کے ساتھ ظاہری محاسن سے بھی آراستہ و پیراستہ ہے
بہترین عکسی طباعت ○ سنہری ڈائی دار جلد ○ محصول ڈاک بذمہ خریدار
([illegible] کے مقابلہ کتب میں اول آنے والی کتاب) (ربیع الاول میں منگوانے پر ۱۰/- روپے مع محصول ڈاک)
مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ ۳۴ اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور